# شعری متن کا ترجمہ: اسلوبیاتی مسائل

ڈاکٹر فاخرہ نورین ☆

**Abstract:**

Any literary work is a representative of its SL Poly system but a poem has its meanings in its structure as well.Whatever seems illogical and meaningless in prose becomes otherwise in poetry.Problems faced by a poetry translator are numerous and stylistic problems are significantly important among them.There are many strategies suggested by translators and theorists to cope up with the problem.It is very difficult rather almost impossible to translate poetry in true spirit by not damaging its lingual,stylistic or poetical worth.Translator of poetry has to sacrifice some of it, though it is his choice what to keep and what will be sacrificed.

ترجمہ خواہ کسی بھی ادبی فن پارے کا ہو مگر اس کی اسلوبیاتی ساختوں کو سمجھے بغیر نہیں کیا جا سکتا کیونکہ یہ مصنف یا ادیب کے منشاء کے ساتھ ساتھ اس پورے ادبی نظام کو بھی نمائندگی کر رہا ہوتا ہے۔نظم کی عروضی ساخت اس

☆ شعبہ اردو، گورنمنٹ کالج برائے خواتین، راولپنڈی

کے مفاہیم کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہوتی ہے۔ ممکن ہے بظاہر الفاظ کی ترتیب میں کوئی منطقی ربط نظر نہ آ رہا ہو۔ مگر نظم میں یہی بے ترتیبی اور بے ربطی ان لامحدود معانی کا وسیلہ بن جاتی ہے جو شاعری کی خصوصیت ہوتے ہیں۔ آزاد نظم میں سارا تاثر اور مفاہیم کی ترسیل الفاظ کی اسی بے ربطی میں پوشیدہ ہوتا ہے۔ بے معنویت ہی دراصل معنویت کی حامل بن جاتی ہے۔ این بیسنٹ اس سلسلے میں نوم چومسکی کے بے معنی جملے کی مثال دیتے ہوئے لکھتی ہے۔

> اس نکتے کی وضاحت کے لیے اگر ہم نوم چومسکی کے مشہور ''بے معنی'' جملے: بے رنگ سبز خیالات سوتے ہیں غضبناک ہو کر، کی مثال لیں اور اسے یوں ترتیب دے لیں۔
>
> بے رنگ
>
> سبز خیالات
>
> سوتے ہیں
>
> غضبناک ہو کر
>
> تو جملے کے اجزاء کے درمیان موجود منطقی ہم آہنگی کی کمی قابل قبول ہو جاتی ہے کیونکہ ہر 'سطر' ایک خیال کی حامل ہو گی اور مجموعی معانی اسی غیر منطقی اجزاء کے ربط اس بظاہر منطقی، با قاعدہ ساخت سے ہی اخذ کیے جائیں گے۔ لہٰذا معانی مواد کی بجائے علامت کے اسیر ہوں گے۔ اس کے لیے انفرادی الفاظ اور خیالات کا ربط دونوں نظم خوانی کے دوران باہم مل جائیں گے۔[1]

چنانچہ یہ مسئلہ انگریزی سے اردو میں شعر کے ترجمے میں شدت سے ابھر کر سامنے آتا ہے کہ اگر نظم کا خیال

اس کی ساخت میں چھپا ہے اور وہ ساخت ہی مجموعی معانی کو سامنے لاتی ہے تو ترجمے میں وہ کس پہلو کو سامنے رکھے؟ ساخت کی بحالی و برقراری کو اگر ہدفی زبان کا ادبی نظام نہ قبول کرتا ہے نہ اس کے متوازی کوئی ساخت فراہم کرتا ہے تو پھر کیا کیا جائے؟ یہاں پر معاملہ ایک بار پھر مترجم کے انتخاب کا محتاج ٹھہرتا ہے۔اور یہاں مترجم کی حیثیت بطور تخلیق کار اور بطور قاری دونوں یکجا ہو جاتی ہیں۔مترجم چونکہ پہلے ماخذ زبان میں متن کا قاری ہوتا ہے اور اس تاثر یا ساخت کو اپنی ہدفی زبان میں منتقل کرنے کی خواہش اس پر دورانِ نظم خوانی طاری ہو جاتی ہے۔تو مترجم کا یہ کام ہے کہ وہ انتخاب کرے کہ اسے نظم کی ساخت کو اپنی زبان کے ادبی نظام میں متعارف کرانا ہے یا اس خیال کو جو اس نظم یا شعر میں بیان کیا گیا ہے۔چونکہ شاعری کا ترجمہ اس تاثر کی منتقلی ہے جو نظم پڑھتے ہوئے قاری پر چھا گیا تو یہ تاثر اس ساخت کی پیداوار ہے یا خیال کی، یہ مترجم ہی بہتر جانتا ہے۔مگر مترجم کو یہ خیال رکھنا پڑتا ہے کہ وہ اصل متن سے زیادہ دور نہ جائے۔یعنی ساخت یا خیال کی برقراری کا سبب بنے۔یہ واضح رہے کہ نظم کے ترجمے میں یہ امر کافی حد تک محال ہے کہ نظم کی ساخت اور خیال دونوں کو بعینہٖ منتقل کر دیا جائے۔ترجمہ دراصل ماخذ زبان کی موت کا نتیجہ ہوتا ہے۔ڈاکٹر عنوان چشتی ''منظوم ترجمے کا عمل'' میں رقمطراز ہیں:

> اعلیٰ ترجمے وہ ہیں جو شاعر کے خیال یا جذبے کو من و عن پیش کرتے ہیں۔اس میں علامتوں، استعاروں اور پیکروں کے نظام کو خاص اہمیت دی جاتی ہے، ترجمے کو حذف و اضافہ سے پاک رکھا جاتا ہے۔اس کے علاوہ بلیغ اشاروں، حکیمانہ لفظوں، فلسفیانہ خیالات، جذبے کی رو اور تاثر کو پوری شادابی اور شدت کے ساتھ ترجمے میں سمویا جاتا ہے۔اس میں بنیادی خیال جذبہ یا فکر کے ساتھ زبان، تکنیک اور اسلوب پر بھی توجہ دی جاتی ہے گویا ترجمے میں فن کے خارجی اور داخلی

عناصر کا خوبصورت امتزاج ہوتا ہے۔[۲]

ان داخلی و خارجی عناصر کو یوں مدنظر رکھنا کہ من و عن دوسری زبان میں منتقل ہو جائیں۔ یہ ممکن نہیں ہے خصوصاً شاعری میں تو یہ اور بھی مشکل ہو جاتا ہے کیونکہ دونوں زبانوں کے مزاج کا فرق اور خود شعری متن کی پیچیدگیاں، وہ ابہام اور ان کہی بات جو شعر کا حسن ہوتی ہے اسے بعینہٖ ترجمے میں منتقل کرنے کی راہ میں رکاوٹ ثابت ہو گا۔ کسی بھی خیال کو اسلوب سے الگ نہیں کیا جا سکتا مگر شعر میں تو خصوصاً اسلوب اور خیال دونوں ایک دوسرے کا لازمی جزو ہوتے ہیں۔ یہ توقع رکھنا کہ ترجمہ بھی تخلیق کی تمام تر خصوصیات کا حامل ہو گا عبث ہے کیونکہ مترجم بہر حال تخلیق کار نہیں ہے وہ کسی دوسرے تخلیق کار کا ترجمان ہے۔ کسی بھی نظم کے ترجمے میں ہدفی زبان کی موجودہ ادبی روایات اگر چیلنج ہوتی ہیں تو مترجم اور قارئین کے ساتھ ساتھ ناقدین کو بھی چیں بچیں ہونے کے بجائے اسے مترجم کی کامیابی گردانا چاہیے۔ کیونکہ مروجہ روایت، ساختوں اور ہیئتوں پر پورا نہ اترنا خشتِ اول کی حیثیت رکھتا ہے جس کی پیروی اور اس کو بہتر بنانے سے ممکن ہے کہ شعریات میں کوئی نئی تبدیلی آئے جو مثبت بھی ہو اور اظہار کا بہتر وسیلہ بھی۔ ایسے ترجمے جن کو عمومی تاثر کے مطابق ناکام تراجم سمجھا جاتا ہے یہی دراصل کامیاب کوشش ثابت ہوتے ہیں جو ماخذ زبان کے اسلوبیاتی اور ساختیاتی پہلوؤں کی نشاندہی کے ساتھ ساتھ ہدفی زبان میں موجود کمی اور کجی کو بھی ظاہر کرتے ہیں اور ظاہر ہے کہ اس خارجی اور کجی کی نشاندہی تعمیر نو اور بہتری کی طرف پہلا قدم ثابت ہوتی ہے۔

شاعری کے ترجمے کے عروضی مسائل پر بات کرتے ہوئے این بیسنٹ اس امر کو قابلِ افسوس قرار دیتی ہے کہ مترجم ہمیشہ کسی ایک طریقہ ترجمہ کو اپنے سامنے مدنظر رکھتا ہے اس ضمن میں وہ آندرے لیفیور کی ان سات حکمت عملیوں کا ذکر کرتی ہے جو شاعری کے ترجمے کے ضمن میں اطلاقی حیثیت رکھتی ہیں۔ یہ سات حکمت عملیاں یا طریقہ ہائے ترجمہ مندرجہ ذیل ہیں۔[۳]

۱۔ فونیمک ترجمہ

یہ ترجمے کی وہ قسم ہے جو نظم کے صوتی تاثر کو ہدفی زبان میں منتقل کرنے پر زور دیتی ہے اور خیال یا مضمون کو اپنے الفاظ میں بیان کرتی ہے۔اس طریقہ ترجمہ کے نتیجے میں صوتی اعتبار سے تو نظم اصل متن کے قریب ہوتی ہے مگر اس بات کا غالب امکان ہوتا ہے کہ خیال ابہام کا شکار ہو جائے کیونکہ اس طریق ترجمہ میں خیال کو ثانوی حیثیت دی جاتی ہے۔

۲۔ لفظی ترجمہ

لفظی ترجمہ اصل متن کے ایک ایک لفظ کو ہدفی زبان کے متبادل لفظ کے ذریعے گویا مکھی پر مکھی مارتے ہوئے کیا جاتا ہے جو ظاہر ہے نہ صرف اصل جملے کی نحوی ساخت میں خرابی کا سبب

بنتا ہے بلکہ مطلب بھی بدل کر کچھ سے کچھ ہو جانے کا قوی امکان ہوتا ہے۔

۳۔ میٹریکل ترجمہ

یہ طریق ترجمہ بھی لفظی ترجمے کی طرح یک جہت ہوتا ہے۔لہٰذا معانی اور ساخت دونوں کو خراب کرتا

ہے۔

۴۔ نظم کا ترجمہ نثر میں

نظم کا ترجمہ نثر میں کرتے ہوئے سب سے پہلے تو اس تاثر کی قربانی دی جاتی ہے جو نظم کی اصل ہے۔ ابلاغ کی وہ سطح اور جملے کی نحوی ساخت بھی برقرار نہیں رہتی مگر اس میں کم از کم اتنا نقصان نہیں ہوتا جتنا لفظی اور میٹریکل ترجمے کی صورت میں ہوتا ہے یعنی کم از کم مضمون کا ابلاغ ہو جاتا ہے۔

۵۔ مقفٰی ترجمہ

دراصل مترجم کی طرف سے مصیبت کو دعوت دینے کے مترادف ہوتا ہے کیونکہ مترجم کو میٹر کے ساتھ ساتھ قوافی کا التزام بھی رکھنا پڑتا ہے جو ظاہر ہے بین اللسانی ترجمے میں ایک نہایت مشکل فیصلہ ہے۔ اور ظاہری بات ہے کہ اس کا نتیجہ بقول آندرے مستا کے کی شکل میں ہی نکلتا ہے۔

۶۔ نظم معریٰ ترجمہ

اس میں پابندیاں تو وہی ساختیاتی ہوتی ہیں مگر بہر حال لفظی ترجمہ بہتر اور معانی زیادہ قطعیت کے ساتھ منتقل ہوتے ہیں۔

۷۔ توضیحی ترجمہ

اس طریق ترجمہ میں موضوع اور مواد تو ہدفی زبان میں بھی برقرار رہتا ہے مگر نظم کی ہیئت تبدیل ہو جاتی۔ دراصل یہ ایک طرح سے مترجم کی ایک اپنی نظم ہوتی ہے میں اصل نظم کا موضوع اور نقطہ نظر تو ہوتا ہے مگر دراصل یہ ایک طرح سے نئے پیکر میں ڈھلنے کے مترادف ہے۔ آندرے لیفیور اس عمل کے لیے Version کی اصطلاح استعمال کرتا ہے۔

مگر سوزن بیسنٹ ان تمام طریقوں کے خلاف ہے اور لکھتی ہے کہ نظم تو ایک نامیاتی کل ہے اس کی اس کلیت کو مدنظر رکھنا ضروری ہے تا کہ نظم اپنے پورے تاثر سمیت ترجمے کے ذریعے منتقل ہو جائے۔ مندرجہ بالا تمام طریقے دراصل ترجمے کی مختلف تکنیکیں ہیں۔ جن میں سے کسی ایک پر زور دینے سے باقی نظم پوری کی پوری قربان کر دی جاتی ہے۔ لہٰذا سوزن بیسنٹ آندرے کی اصطلاح ورژن Version کو ناپسند کرتی ہے کیونکہ اس اصطلاح کے استعمال سے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ترجمہ اس سے کوئی مختلف عمل ہے۔ کیونکہ مترجم وہی کام کرتا ہے کہ نظم کو عموماً ایک

نئے پیکر میں ڈھال دیتا ہے لہٰذا version کی اصطلاح استعمال کرنے کے بجائے اسے ترجمہ ہی قرار دیا جانا چاہیے۔

شعر کے ترجمے میں پیش آمدہ مشکلات میں ایک اور مشکل یہ ہے کہ ہر زبان اپنی تہذیبی وثقافتی زمین میں مضبوطی سے جڑیں گاڑے ہوتی ہے۔ وہ اپنی نمو اور نشوونما کے لیے اسی تہذیب اور ثقافت سے پانی اور دیگر نمکیات لیتی ہے۔ مقامیت کی بوباس اس کو مہکاتی ہے۔ عموماً ہر زبان

کی شاعری اس قوم کی مجموعی عادات، قومی آداب دینی عقائد حتیٰ کہ اوہام وتوہمات لوک قصے کہانیوں، مذہبی قصائد اور قومی سطح کی مشترک فرضی وحقیقی داستانوں سے مماثل ہوتے ہیں۔ لہٰذا ان کی تفہیم میں سب سے زیادہ کردار قاری کا اپنا ذہنی وتہذیبی پس منظر ادا کرتا ہے۔ قاری پر جو تاثر کسی شعر سے قائم ہوتا ہے وہ اس کے اپنے تہذیبی علامتی نظام سے واقفیت اور اس کی تمام نزاکتوں سے باخبر ہونے کی بدولت ہوتا ہے۔ مترجم اس تاثر کو اپنی زبان میں کیسے پیدا کرے گا یہ ایک مسئلہ ہے۔

اشعار میں دیگر اصناف ادب کی نسبت تہذیبی تلمیحات وعلامات کا زیادہ عمل دخل ہوتا ہے کیونکہ یہ صنائع شعری کے ذیل میں آتے ہیں جن کی مدد سے شاعر کی قادر الکلامی اور فنی مہارت کا پتہ چلتا ہے۔ مثلاً مسلمانوں کے مذہبی قصائص اور عقائد میں سے قصہ یوسف سے متعلق تمام تر تلمیحات، جن میں چاہِ کنعان، ماہِ کنعان، گریہ یعقوب، پیراہن یوسف، زلیخا، عزیز مصر اور برادران یوسف وغیرہ اگر کسی شعر میں آئیں تو چونکہ انھوں نے قرآن مجید میں یہ قصہ پوری تفصیل سے پڑھ یا سن رکھا ہے اور یہ تمام باریک نکات ان کے اذہان میں پہلے سے موجود ہیں اس لیے یہ تلمیحات اور ان کے متعلقات ان کے لیے شعر خوانی اور تاثر کی دلنشینی کا سبب بن جاتی ہے اور ان کا تخیل ان تمام جزئیات سمیت شعر کو دیکھ لیتا ہے۔ پھر انگریزی زبان میں کورٹ شپ کا تصور مشرقی اذہان کے لیے عموماً ناقابلِ فہم

ہوتا ہے کیونکہ یہ کچھ انگریز تہذیب کا ہی حصہ ہے بالکل اسی طرح جس طرح کاروکاری یا غیرت کا تصور مغرب کی سمجھ سے باہر ہے۔ جہاں عورت کے لیے تہذیبی سطح پر ایک فرد کا مقام متعین ہے۔ یہاں شعر کا ترجمہ محض عروضی یا بیان کا مسئلہ نہیں رہ جاتا بلکہ یہ اپنے ادبی نظام اور تہذیب کی تفہیم و توضیح بھی بن جاتا ہے۔ لہٰذا مترجم کے لیے تہذیبی و ثقافتی تفاوت کو جاننا ضروری ہے۔ تہذیبی علامتوں کے علاوہ بعض ایسے عام الفاظ بھی ہیں جو کسی کلچر کا حصہ ہونے کے سبب ناقابلِ ترجمہ شمار ہوتے ہیں۔ مثلاً دھوتی، صافہ، چوپال، وغیرہ وغیرہ۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مترجم ان الفاظ اور علامات و تلمیحات کا کیا کرے؟ وہ کس طرح ہدفی زبان کے قاری کو وہ تاثر منتقل کر سکے جو شعر کے کامیاب ترجمے کی اولین شرط ہے یعنی ترجمہ شدہ متن کا وہی تاثر ہدفی زبان کے قاری پر مرتب ہو جو ماخذ زبان کے قاری پر اصل متن شعر کو پڑھ کر قائم ہوا تھا۔

شاید اس کی بہترین مثال ہم ایذرا پاؤنڈ کے اس طریق ترجمہ سے دے سکتے ہیں جو (Homage to Sentus Propertius) میں اپنایا گیا یعنی زبان کو جدید بنانے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی۔ شاعر کے اپنے ہی الفاظ کو ترجمے کی زبان میں بعینہٖ رکھ دیا گیا جو زبان میں غرابت اور آرکائیک ہونے کا تاثر پیدا کرتی ہے۔ یعنی آرکائیک ازم کو ترجمے کی تکنیک کے طور پر استعمال کیا ہے۔ اس تکنیک میں دقت یہ ہوگی کہ مترجم کو صفحہ در صفحہ حاشی یا پاورقی نوٹ لکھنے پڑیں گے جو ایک مشقت بھی ہے۔ اور بعض اوقات تو مضحکہ خیز بھی لگتا ہے کہ شعر کا ترجمہ تو دو سطور میں ہو گیا مگر تلمیح یا علامت کی وضاحت صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ اسی صورتِ حال کی بدولت ولادیمیر نابوکوو نے شاعری کے ترجمے کو ناممکن قرار دیتے ہوئے یہ فیصلہ صادر کیا تھا کہ اگر ترجمے سے زیادہ مترجم کو حاشی لکھنے پڑیں تو پھر اس کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ شاعری کو ترجمہ نہ ہی کیا جائے۔ یعنی کسی شعر یا نظم کے قابلِ ترجمہ ہونے کا مطلب یہ ہوگا کہ اگر وہ ہدفی زبان میں

منتقل ہو جائے اور اس کے لیے وضاحتی نوٹ نہ لکھنے پڑیں اور جہاں یہ صورت حال پیش آ جائے وہاں شعر کو نا قابلِ ترجمہ قرار دے دیا جانا چاہیے۔

اس طریق ترجمہ اور سوچ کے انداز کو قدرے بہتر بنایا جانا چاہیے کیونکہ پہلی بار ترجمہ ہونے پر الفاظ و خیالات ترجمہ کی زبان وادب کے لیے نئے ہی ہوتے ہیں ترجمے کا مقصد محض خیالات وافکار کی تجدید و وسعت اور اسالیب میں تنوع پیدا کرنا ہی نہیں ہے بلکہ یہ بنیادی سطح یعنی لفظ کی سطح پر بھی کارآمد ہوتے ہیں۔ تہذیبی حوالوں علامتوں اور تلمیحات کے نا قابل ترجمہ یا نا قابلِ انتقال ہونے کے سبب عالمی ادب کا معتد بہ حصہ نا قابلِ ترجمہ اور محض علاقائی ادب کی حیثیت اختیار کر جائے گا۔لہٰذا جس طرح اصطلاحات کی وضع وتشہیر وترویج میں یہ اصول لاگو ہے کہ بعض اصطلاحات کو بعینہٖ قبول کر لیا جاتا ہے مثلاً کمپیوٹر، ہارڈویئر، سافٹ ویئر وغیرہ تو اسی طرح ان تہذیبی علامات کو بھی قبول کر کے زبان میں اس کی ترویج ہونی چاہیے۔لفظ دراصل جتنا زیادہ استعمال ہوگا اس کی غرابت اتنی ہی تیزی سے ختم ہوگی۔اور وہ اتنی ہی جلدی زبان کے لسانی نظام کا حصہ بن جائے گا۔لہٰذا مترجم کو الفاظ کی غرابت سے خوفزدہ ہونے کے بجائے اسے اپنی زبان کے لغت میں قابلِ قدر اضافہ کرنا چاہیے۔

یہاں ایک اور بات بھی قابل ذکر ہے کہ ترجمے کی کامیابی کا انحصار یا دارومدار محض مترجم ہی پر نہیں ہے بلکہ اس میں ایک اہم کردار ہدفی زبان کے لسانی نظام کے پیشہ وروں کو بھی ادا کرنا پڑتا ہے۔وہ اثر انگیز عوامل میں نہایت اہم عامل ہوتے ہیں۔ان پیشہ وروں میں نقاد اور مبصرین، اساتذہ اور مترجم خود شامل ہوتے ہیں۔یہ وہ تمام افراد ہیں جن کے ذمے عوام یا قاری کی آراء کی

تشکیل اور ادبی منظر نامے میں کسی تخلیق یا ترجمے کے مقام کا تعین ہوتا ہے۔لہٰذا نقاد اپنے تنقیدی مضامین میں، مبصرین اپنے تبصروں اور آراء میں اساتذہ اپنی تدریس اور انتخاب متن کے مرحلے میں کسی ایسے ترجمہ شدہ متن کو منتخب

کر کے جس میں مترجم نے آرکائیک اور غرابت زدہ الفاظ استعمال کیے ہوں اور یوں اصل زبان کا ذائقہ محفوظ رکھا ہو، اس طریق ترجمہ کو فروغ دیا جا سکتا ہے۔ دوسری طرف خود مترجم کو بھی خود کو دوہری مشقت کے لیے تیار کرنا ہو گا یعنی ایک تو آرکائیک کی تشریح و توضیح کے لیے صفحے کے صفحے لکھنے ہوں گے دوسرا اپنی اس کوشش کو مسلسل جاری رکھنا ہو گا تا کہ اس کی پہلی مشقت بھی ضائع نہ ہو جائے۔

شعری متن کے ترجمے کی ایک اور اہم مشکل یہ ہے کہ شعر اظہار ذات اور داخلیت سے منسوب ہے۔ اگرچہ انگریزی شعراء کا رجحان زیادہ تر خارجیت اور فطرت کے مظاہر کے بیان کی طرف رہا ہے مگر پھر بھی بہر حال کوئی داخلی جذبہ یا محرک اسے خارجی موضوعات و مظاہر میں سے کسی ایک کے انتخاب پر مجبور کرتا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ شاعر کوئی تہذیبی یا عوامی علامت استعمال کر کے اس میں ذاتی ترجمہ بھی بیان کر رہا ہو۔ مثلاً اردو میں برادرانِ یوسف محض خارجی و تہذیبی علامت ہی نہیں ہے بلکہ شاعر کا ذاتی تجربہ بھی اس علامت کے ذیل میں بخوبی بیان ہو سکتا ہے۔ انگریزی شاعر جان کیٹس اپنی مشہور نظم When I have fears میں جب کائناتی مظاہر کو دیکھ کر خوف کھاتا ہے اور کہتا ہے۔

"When I have fears"

When I have fears that I may cease to be

Before my pen has glean'd my teeming brain,
Before high-piled books, in charactery,
Hold like rich garners the full ripen'd grains;
When I behold, upon the night's starred face,

Huge cloudy symbols of a high romance,

And think that I may never live to trace

Their shadows, with the magic hand of chance;

And when I feel, fair creature of an hour,

That I shall never look upon thee more,

Never have relish in the faery power

Of unreflecting love; --- then on the shore

Of the wide world I stand alone, and think

Till love and fame to nothingneu do sin[۴]

تو اس میں ایک تو موت کا بطور عالمگیر سچائی ہونا موجود ہے ہر ذی روح کو مرنا ہے اور موت سارے منصوبے نامکمل اور دھرے کے دھرے رکھ دیتی ہے مگر اس عالمگیر سچائی کے ساتھ ساتھ کیٹس کی وہ حد درجہ بڑھتی ہوئی حساسیت بھی تھی جو ٹی بی جیسے سماجی موذی اور (اس وقت) لاعلاج مرض میں مبتلا شخص کو چیزوں کی طرف حسرت اور خوف سے دیکھنے کا رویہ پیدا کر دیتی ہے۔اور ایسا انسان عام انسانوں کی نسبت قدرے بڑھے ہوئے خوف یا تکلیف کا احساس رکھنے

لگتا ہے۔چیزوں کی قدر و قیمت اس کے لیے بڑھ جاتی ہے اور وہ زیادہ گہرائی میں جا کر محسوس کرنے لگتا ہے۔ایسے مجموعی احساسات کے اندر لپٹے ذاتی تجربے اور قلبی واردات کو ترجمہ کرنا بھی شاعری کے ترجمے کی ایک اہم مشکل ہے۔اس کے لیے مترجم کا نہ صرف اس عہد بلکہ شاعر کی ذاتی زندگی، اس کی علامات کے نظام سے واقفیت اور ان کے متعلق شاعر کے رجحان کو سمجھنے کی صلاحیت رکھنا بھی ضروری ہے۔

شعری ترجمے کی ایک اور مشکل یہ سمجھنا بھی ہے کہ مترجم کس کلچر یا ثقافت کو سمجھتا ہے۔ دراصل یہ تعین کرنا ہی مشکل ہے کہ کہاں ایک ثقافت ختم اور دوسری شروع ہو گئی۔ ثقافتی مسائل بظاہر ایک نظر آنے والی ثقافت میں بھی ہیں مثلاً ادب میں تانیثیت۔ اردو میں کہنے کو تو ماہ لقا بائی چندا، زہرہ نگاہ، ادا جعفری، پروین شاکر، نوشی گیلانی، کشور ناہید اور فہمیدہ ریاض تمام کی تمام خواتین شاعرات ہیں مگر کیا مہ لقا بائی چندا اور فہمیدہ ریاض کی شعری اپروچ کو ایک ہی انداز میں سمجھا جا سکتا ہے؟ ہرگز نہیں کیونکہ ایک ہی معاشرے اور ایک ہی جیسے حالات اور ایک ہی عہد میں لکھنے والے تخلیق کاروں کے فن پاروں کو بھی ایک ہی پیمانے یا اپروچ سے نہیں سمجھا جا سکتا تو مختلف عہد، حالات، ذاتی و معاشرتی حالات کے ساتھ ساتھ مختلف شخصیات اور داخلی رجحانات اور رویے رکھنے والے تخلیق کاروں کے شعری تفہیم کے لیے کوئی فارمولا وضع کرنا اور اس کی قطعیت کا قائل ہونا کہاں تک مناسب ہے۔ ایک ہی والدین کی اولاد جو عموماً ایک جیسے حالات اور رویوں کی پیداوار ہوتے ہیں میں بھی چند اشتراکات کے ساتھ ساتھ اختلافات اپنی اپنی جگہ ہوتے ہیں۔ شخصی و ذاتی تنوع اور فرق ایک ہی والدین کی اولاد کے فن پاروں کی تفہیم کو متفرق بنا دیتا

ہے تو کسی ایک خطے میں مختلف حالات و ادوار کی پیداوار تخلیق کاروں کو سمجھنے کا دعویٰ کرنا ہی محال ہے۔ ہاں چند اشتراکات مثلاً نظم کی ہیئت، مشترک ادبی روایت کی موجودگی اور صنف کے تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے کوئی اصول تو مرتب کیا جا سکتا ہے مگر ان کی حیثیت خالصتاً معروضی ہو گی۔ داخلی حقائق اور موضوعات کی تفہیم اور ترجمے میں ان کی باز آفرینی ہی وہ عمل ہے جو ترجمے کو تخلیق اور مترجم کو تخلیق کار کے درجے پر فائز کر دیتا ہے اور یہی وہ مقام ہے جب مترجم کا کام ترجمانی سے کہیں آگے بڑھ کر داخلیت کی سطح کو چھو لیتا ہے۔

ابلاغ کا نقطۂ عروج وہ منزل ہے جہاں قاری کے ذہن پر ایک سے زیادہ معانی
کا انکشاف ہوتا ہے اور اس کو ایک شعر میں بہت سے جلوہ ہائے معانی نظر آتے

ہیں۔مثلاً غالب کے بہت سے شعر معانی کے اعتبار سے ایک سے زیادہ امکانات کے حامل ہیں یہ امکانات کبھی ایک ہی مفہوم کے مختلف پہلو ہوتے ہیں اور کبھی ایک دوسرے سے متضاد ہوتے ہیں۔معانی کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرنا مترجم کا نہیں تشریح نگار کا کام ہے۔ایسے موقعوں پر مترجم ہجوم معانی سے ایک کا انتخاب کر کے دوسرے معانی کو چھوڑ دیتا ہے انتخاب و اجتناب کا یہ عمل ایک شعوری عمل اور مصنف کے فلسفۂ زندگی، اندازِ نگارش،موضوع کی مناسبت اور عبارت کے سیاق وسباق کی روشنی میں کیا جاتا ہے۔مفہوم کے انتخاب کی کامیابی کا معیار یہ ہے کہ وہ کل مفہوم کے ایک جز کی حیثیت سے کل سے کتنا قریب ہے۔یعنی وہ منتخب مفہوم کل کا لازمی، منطقی اور فطری حصہ ہے یا نہیں۔دراصل انتخاب مفہوم کا مسئلہ کلیتہً مترجم پر منحصر ہے کہ وہ آئینہ کس رخ سے پکڑتا ہے اور شاہد معنی کا کون سا جلوہ دیکھتا ہے۔[۵]

معانی کی یہی رنگا رنگی کسی فن پارے کے مسلسل تراجم کا سبب بنتی ہے۔کسی بھی شعر یا نظم کی تخلیق کا عروج اس کا ترجمہ ہونا اور ہوتے چلے جانا ہے۔ایک ہی نظم کے تراجم جو دو مختلف مترجمین نے کیے ہوئے ہوں، میں بہت فرق آجاتا ہے حالانکہ دونوں کی اصل تو وہی متن ہوتا ہے جو خود شاعر کی تخلیق ہے مگر ہر مترجم اور ہدفی زبان کا معانی کا نظام مختلف ہونے کے ساتھ ساتھ مترجم کی اپنی تشریح اور اس نظم کی تعبیر ہوتی ہے نیز یہ کہ اس تعبیر کو مترجم کیسے کسی سانچے میں ڈھالتا ہے۔ترجمے کے عمل کی خوبصورتی تعبیر کے اسی تنوع میں ہے جس میں مترجم متن سے وفادار بھی ہوتا ہے اور اپنی تعبیر کو بھی ہدفی زبان کے قاری تک پہنچا رہا ہوتا ہے۔تعبیروں کا یہ تنوع مترجم کے ساتھ ساتھ اس عہد کے

تنوع کی پیداوار بھی ہوتا ہے جس میں کوئی متن ترجمہ کیا جا رہا ہو۔ جب تاثر آفرینی کی بات ہوتی ہے تو قاری کی شمولیت ترجمے کے عمل میں لازم ہو جاتی ہے۔ چونکہ پہلا قاری خود مترجم ہوتا ہے جس کے ذوق کی تشکیل میں اس عہد کی ادبی روایت اور ادبی رویوں کا بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔ لہٰذا ہر ترجمہ اس عہد کی پیداوار بھی ہوتا ہے۔ وقت کی انھی حد بندیوں کی بدولت تخلیق اور ترجمے یا اصل متن اور ترجمہ شدہ متن کی خوبیاں ظاہر ہوتی ہیں یعنی ہر ترجمہ اپنے عہد کی پیداوار جبکہ ہر اصل متن ہر عہد میں قابل ترجمہ ہو کر ہر عہد کا ہو جانے کی صلاحیت

رکھتا ہے۔ وقت کی حد بندیوں اور معاشرتی اقدار کی محدودیت سے ماورا اصل متن ہر زمانے میں ایک نئی نظم کی تشکیل و تخلیق کا محرک بن جاتا ہے۔ چنانچہ یہ کہنا بجا ہوگا کہ ترجمے کے سلسلے میں کسی شعری متن کا کوئی بھی ترجمہ حتمی نہیں ہے بلکہ یہ ایک مسلسل عمل ہے جسے وقت یا مقام کی کوئی قید نہیں روک سکتی۔ ماخذ زبان کے شعری متن کی ہدفی زبان میں ترجمانی یا منتقلی میں جہاں تہذیبوں، وقت اور مقام کی خلیج حائل ہو وہاں ترجمہ شدہ متن کی کیا حالت ہوگی؟

> تمام ترجمے انفرادی مترجمین کی قرأت، تعبیروں اور ترجمے اور اصل متن کے باہمی تعامل کے تصور کے نتیجے میں متعین ہونے والے معیار کے انتخاب کے عکاس ہوتے ہیں۔ لہٰذا جائزہ لیے جانے والی نظموں سے ہم دیکھ سکتے ہیں کہ بعض جگہوں پر زبان اور لہجے کو جدید بنانا ترجیحی عمل رہا ہے، جبکہ بعض اور جگہوں پر شعوری طور پر آرکائیک بنانے کا عمل غالب خصوصیت رہا ہے۔ ان کوششوں کی کامیابی یا ناکامی کا تعین قاری پر چھوڑ دینا چاہیے مگر طریق کار کا یہ تنوع اس نکتے پر زور ضرور دیتا ہے کہ جس طرح کسی نظم کی تخلیق کا کوئی ایک صحیح طریقہ نہیں ہے اسی طرح کسی نظم کے ترجمے کا بھی کوئی ایک صحیح طریقہ نہیں ہے۔[۲]

اس تمام بحث کو سمیٹتے ہوئے اگر کوئی بات فی الحال حرفِ آخر کے طور پر کہی جا سکتی ہے تو وہ یہی ہو سکتی ہے کہ شعر کا ترجمہ ناممکنات میں سے کہا جاتا ہے مگر یہ ایسا ناممکن بھی نہیں ہے کیونکہ

ترجمے کے لیے ضروری ہے کہ مترجم خود اعلیٰ شعری ذوق کا مالک ہو اور دوسری زبان کے اس شاعر کے ہنر کی گہرائی اور شعری رویے کو سمجھتا ہو۔ ماخذ زبان کے علاوہ ہدفی زبان میں بھی ماہر ہوتا کہ دونوں زبانوں کے متبادل امثال، ظرائف اور محاوروں پر عبور رکھتا ہو۔ اور اگر مترجم خود شاعر ہو تو اسے یہ بھی احتیاط لازم ہے کہ وہ ترجمے کو اپنی تخلیق نہ بنا دے اور اپنے اسلوب میں مکمل طور پر نہ ڈھال دے۔

شعر کے ترجمے میں جتنا زیادہ شاعرانہ حسن ہو گا مترجم کی اتنی ہی محنت اس پر لگی ہو گی۔ لیکن شاعری کے شاعر مترجم کے بغیر بھی ترجمہ مشکل ہوتا ہے۔ خلیق انجم لکھتے ہیں:

> نظم میں ترجمہ کرنے کے لیے مترجم کا شاعر ہونا ضروری ہے۔ ایسی صورت میں مترجم کی اپنی شاعرانہ شخصیت ہو گی جسے وہ اپنی پوری کوشش کے باوجود ترجمے سے الگ نہیں رکھ سکتا۔ اگر مترجم اچھا شاعر ہے تو اس کا امکان ہے کہ ترجمہ اصل سے بہتر ہو جائے۔ دوسری صورت میں ترجمہ اصل سے برا ہو گا۔ مترجم عظیم مصنف تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے اور جب ناکام ہو جاتا ہے تو اسے اپنی سطح پر لے آتا ہے۔[۶]

شعری متن کے ترجمے کے گوناگوں مسائل اور مشکلات کے ساتھ ساتھ کسی معیار کو برقرار رکھنا ایک ایسا عمل ہے جو اتنا پیچیدہ ہے کہ اسے ناکامی کا فن قرار دیا جا سکتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ شعر کا ترجمہ تو ہو جاتا ہے مگر شاعری غائب ہو جاتی ہے۔ تو دراصل شعر کا ترجمہ ناکامی کا وہ

عمل کہا جا سکتا ہے جس میں مترجم حتی الوسع اپنی اس ناکامی کو بہتر سے بہتر شکل میں پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے جو کچھ وہ اس کوشش میں منتقل کر پائے وہ تو ترجمہ کہلائے گا اور جو منتقل نہ ہو پائے اسے شاعری یا شعریت کہا جائے گا۔

## حوالہ جات

۱۔ Bassnett, Susan, Translation Studies, Routledge, 11 New Fetter Lanne London, EC4P 4EE, P108,104

اصل متن یہ ہے:

"To illustrate this point, if we take Noam chomsky's famous 'meaningless' sentence Colourless green ideas sleep furiously and arrange it as

Colourless

green ideas

sleep

furiously

the apparent lack of logical harmany between the elements of the sentence could becаme acceptable, since each 'line' would add an idea and the overall meaning would derive from the association of

illogical elements in a seemingly logical regular structure. The meaning, therefore, would not be content bound, in that both the individual words and the association of idea would accumulation meaning as the poem is read.

۲۔ عنوان چشتی، ڈاکٹر، منظوم ترجمے کا عمل، مشمولہ ترجمہ کا فن اور روایت، مرتبہ قمر رئیس ایجوکیشنل بک ہاؤس، مسلم یونیورسٹی مارکیٹ علی گڑھ۲، طبع دوم، ۲۰۰۴ء، ص ۱۴۹

۳۔ Bassnett, Susan, Translation Studies, Routledge, 11 New Fetter Lanne London, EC4P 4EE, P108,104

۴۔ Eastman. M. Arthur, The Norton Anthology of Poetry, P.685 Keats, John

۵۔ عنوان چشتی، ڈاکٹر، منظوم ترجمے کا عمل، مشمولہ ترجمہ کا فن اور روایت، ص ۱۴۰

۶۔ Sussan Bassnett, Translation Studies, Routledge, P 102

اصل متن یہ ہے:

"All the translations reflect the individual translators, readings, interpretations, and selection of criteria determined by the concept of the function both of the translation and of the original tent. So from the poems examined we can see that in some cases modernization of language and tone

has received priority treatment, whilst in other cases conscious archaization has been a dominant determining feature. The success or failure of these attempts must be left to the discretion of the reader, but the variations in the method do serve to emphasize the point that there is no single right way of translating a poem just as there is no single right way of writing one either." P102

۷۳۔ خلیق انجم، شاعری کا ترجمہ، مشمولہ فن ترجمہ نگاری، مرتبہ خلیق انجم، طبع سوم، ۱۹۹۶ء، ص ۱۴۱